ہے یا صاحب حال ہے یا بے حال ہے؟ خواجہ مودودی نے فرمایا "اس پر ایک حال طاری ہے اور ایسے حال والے کو "مسافر" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ حالت سفر میں ہوتا ہے، نہ درجۂ سلوک میں ہوتا ہے نہ حالت جذب میں اور نہ حالت سکر میں" فقیر (جامع ملفوظ) نے عرض کیا کہ سفر اور سلوک میں کیا فرق ہے؟ خواجۂ مودودی نے فرمایا " سالک اس کو کہتے ہیں جو اپنی ہمت کو حق کی طلب میں، اعضا رجوارح سے سخت ترین ریاضتیں کر کے صرف کرے، برخلاف مسافر کے اس لئے کہ سفر صوفیا کی اصطلاح میں نام ہے قویٰ کے ذریعہ طلب حق کا" اس کے بعد فرمایا "مجذوب وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطور عطیہ اپنے سے واصل کر لیا ہو۔ اور ان ہی میں سے ولی مادرزاد بھی ہے، مراد، وہ ہے کہ حق سبحانہ اس کا طالب ہے اور وہ گریزاں اور "مرید" وہ ہے جو شب و روز حق سبحانہ کی طلب میں رہتا ہے چنانچہ ایک بزرگ کا قول ہے المرید یطلب والمراد یطلب" (مرید طلب حق میں رہتا ہے اور مراد گریزاں رہتا ہے)

دوران گفتگو میں اعزا خواجہ محمد حسین مودودی نے عرض کیا کہ یہ ضعیفہ جو لکھنؤ کے باہر دیہات میں سکونت پذیر ہے اس کا یہ حال ہے اور کہا کہ کبھی کبھی وہ بات بھی کرتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی ہے بس تھوڑا بہت سمجھ میں آجاتا ہے، خواجہ مودودی نے فرمایا " یہ حال ادھر چند ہی دنوں سے اس پر طاری ہوا ہے" خواجہ حسین نے عرض کیا کہ حضور کو اس کا حال کیسے معلوم ہوا وہ تو مستور الحال ہے اور کوئی اسے نہیں جانتا ہے؟ خواجہ مودودی مسکرائے اور نفحات الانس میں مذکور تحفہؒ کا کچھ احوال بیان فرمایا، اس کے بعد نفحات الانس کو اٹھا کر اس میں تحفہ کا حال نکالا۔ اس میں حضرت سری سقطیؒ کا واقعہ بایں طور درج ہے کہ ایک رات ان کو نیند نہیں آئی اور ساری رات ایسی پریشانی اور بے چینی میں گذری کہ تہجد کی نماز بھی ادا نہ ہو سکی، فجر کی نماز پڑھ کر حضرت سری سقطیؒ ہر اس جگہ گئے جہاں بے چینی دور ہونے کا امکان تھا مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر کار وہ اسپتال پہنچے کہ بیماروں اور اہل ابتلا کے دیکھنے سے شاید بے چینی سے نجات ملے۔ وہاں اسی وقت ایک خوبصورت کنیز لائی گئی تھی جو لباس فاخرہ پہنے تھی اس کے جسم اور لباس سے خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں، اس کے ہاتھ پیر رسی سے بندھے ہوئے

تھے۔ جب اس نے سری سقطی کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور چند اشعار پڑھے، انھوں نے اسپتال کے انچارج سے پوچھا کہ کون کنیز ہے، اس نے بتایا کہ ایک پاگل کنیز ہے اس کا مالک علاج کے لئے اسے یہاں لایا ہے، کنیز نے جب اسپتال کے انچارج کی یہ گفتگو سنی تو اس کا گلا روندھ گیا اور اشعار پڑھنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں دیوانہ پاگل نہیں ہوں میں اس کی (خدا کی) متوالی ہوں اور ہوش وحواس میں ہوں۔ فصلاح الذی زعمتم فسادی، وفسادی الذی زعمتم صلاحی، (تو جس چیز کو تم علاج سمجھے ہو وہ علاج نہیں بگاڑ ہے اور جس چیز کو تم بگاڑ سمجھ رہے ہو وہی میرا علاج ہے) اس کی باتیں سن کر سری سقطی کو رونا آ گیا۔ کنیز نے ان کی آنکھوں میں جو آنسو دیکھے تو بولی "اے دکھاوے والے! یہ رونا اس کی (خدا کی) صفت جاننے پر ہے اور اگر کہیں خدا کو اس طرح مان لے جیسا کہ حق ہے جاننے کا تو تیرا کیا حال ہوگا؟" یہ کہہ کر وہ بے خود ہو گئی۔ تھوڑی دیر اسی عالم میں رہی جب ہوش میں آئی تو سری سقطی نے اسے مخاطب کیا۔ "اے کنیز!" اس نے کہا: "کہو" پوچھا "مجھے کہاں سے جانتی ہو؟" کنیز نے جواب دیا کہ "جب سے اس کو پہچانا ہے اس کے دوستوں سے ناواقف نہیں ہوں"۔

جامع ملفوظ (خواجہ حسن مودودی) کہتا ہے کہ تحفہ رحمہا اللہ کی اس حکایت کے بیان کرنے کا مقصد میرے خیال میں اسی آخری جملہ کا بیان تھا "جب سے اس کو پہچانا ہے اس کے دوستوں سے ناواقف نہیں ہوں" (اس لئے کہ خواجہ مودودی نے یہ حکایت اس سوال پر بیان کی تھی کہ لکھنؤ کی ضعیفہ کو آپ کہاں سے جانتے ہیں) ص۴۷-۴۸-۴۹۔ (باقی ہے)

ممبران ادارہ کی فیس میں کاغذ کی بے انتہا گرانی اور طباعت وکتابت کی اجرتوں میں بے حد اضافہ کے باعث اضافہ کر دیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے

(۱) معاونین ادارہ کی سالانہ فیس	۵۰/-	نوٹ: فہرست ادارہ اور قواعد کی کاپی دفتر سے
(۲) معاونین عام کی سالانہ فیس	۳۰/-	مفت طلب فرمائیں۔
(۳) احباب کی سالانہ فیس	۲۰/-	منیجر ندوۃ المصنفین۔ دہلی ۶

مدراس میں نو دن

سعید احمد اکبر آبادی

مدراس (تامل ناڈو) کے مسلمان بڑے خوش نصیب ہیں کہ قدرت نے ان کو صنعت وحرفت کی مہارت، دولت وثروت کے ساتھ ساتھ دینی اور علمی وتعلیمی ذوق بھی عطا فرمایا ہے۔ اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں نے مسلم ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ کے ماتحت پہلے علامہ اقبال کے خطبات کا اہتمام و انتظام کیا [illegible] کے خطبات بھی اسی ادارہ کے زیر انتظام ہوئے۔ اول الذکر خطبات جو اصلاً انگریزی میں تھے [illegible] اسلامی فکر کی تجدید کے نام سے اردو ترجمہ کی صورت میں بھی مع شرح اور حواشی کے مدیر برہان کے قلم سے عرصہ ہوا چھپ چکے ہیں۔[۱] اس کے

۱؎ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ [illegible] اسلام کے ایک جدید علم الکلام کی بنیاد بن سکتے ہیں [illegible] اس سے ہو سکتا ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے دنوں میں میرے [illegible] پروفیسر تھے۔ ایک مرتبہ ان خطبات پر دہلی [illegible] ایک دن [illegible] تو اس کتاب کو پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اقبال [illegible] جس طرح کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" نے یورپ میں مذہب کا احیا کیا ہے۔ اسی طرح ایک وقت آئے گا جب کہ اقبال کی کتاب یورپ کے مذہبی [illegible] جس زمانہ میں علامہ یہ خطبات لکھ رہے تھے راقم الحروف [illegible] کی تیاری کے [illegible] (باقی صفحہ ۲۰۱ پر)

بعد سید صاحب کے خطبات مدراس ہوئے تو اسلامی اور علمی دنیا میں ان کی بھی دھوم مچ گئی اور ان کا انگریزی میں اور شاید اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ معلوم نہیں یہ انجمن جس کے ماتحت یہ خطبات ہوئے تھے اب بھی ہے یا "آن قدح بشکست وآن ساقی نماند" کے مصداق ختم ہوگئی بہرحال اب ادھر چند سال سے مدراس کے ایک بڑے صنعت کار اور مخیر مسلمان جناب ٹی عبدالواحد صاحب نے اسی قسم کی علمی اور اسلامی سرگرمیوں کے احیا کی غرض سے "ٹی عبدالواحد اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ ادارہ کی دعوت پر گذشتہ سال مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مشکلات القرآن پر چند لکچر اردو میں دیے تھے۔ اور امسال محب قدیم مولانا محمد یوسف صاحب کوکن صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی کے توسط سے ان لکچروں کے لئے راقم الحروف کو دعوت موصول ہوئی تو خاکسار نے اسے بغیر کسی حیلہ حوالہ اور عذر اور بہانہ کے قبول کرلیا۔ یہ بات طے ہوگئی تھی کہ لکچر جولائی میں ہوں گے میں نے تاریخ مقررہ سے دو ماہ قبل ان کو لکھنا شروع کیا تو عجیب بات یہ ہے کہ مدراس کے لئے روانگی سے ٹھیک ایک دن پہلے ان کو پورا کرسکا۔

روانگی | حسب قرارداد ۱۵ر جولائی کو ۱۲ بجے دوپہر پالم سے ہوائی جہاز اڑا اور ٹھیک تین بجے مدراس کے ایر پورٹ پر پہنچا دیا۔ یہاں ٹی عبدالواحد صاحب ان کے ایک رشتہ کے بھائی اور

(باقی حاشیہ ص ۱۹۹) ...... کے سلسلہ میں موصوف نے امام رازی کی کتاب المباحث المشرقیہ کے دو باب جو زمان و مکان پر ہیں ان کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے ذریعہ راقم الحروف سے کرایا تھا اور ترجمہ سے خوش ہوکر حافظ محمود خاں شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" کی ایک جلد اپنے دستخط کے ساتھ عطا فرمائی تھی۔ "بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است" چنانچہ ڈاکٹر چغتائی نے اپنے ایک مقالہ میں جو "سید سلیمان صاحب ندوی کے بعض خطوط علامہ اقبال کے نام" کے عنوان سے سات آٹھ برس ہوئے اردو ادب علی گڑھ میں چھپا تھا اس واقعہ کا ذکر کیا بھی ہے۔

کاروباری شریک جناب حبیب اللہ صاحب اور مولانا کوکن موجود تھے۔ ان کے ساتھ عبدالواحد صاحب کے مکان پر آیا۔ موصوف نے میرے قیام کا انتظام ایک انگریزی ہوٹل میں کیا تھا اور اپنے وسیع و عریض مکان کے ایک حصہ میں بھی جو خود ایک مستقل مکان کی حیثیت رکھتا اور ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ میں نے ہوٹل کے بجائے یہاں قیام کرنا پسند کیا تاکہ لوگوں سے ملنے جلنے میں سہولت رہے۔ واحد صاحب نے ایک مستقل ملازم اسی قیام گاہ کے لئے مخصوص کر دیا جو چوبیس گھنٹے یہیں رہتا تھا۔

خطبہ جمعہ | دوسرے دن یعنی ۱۶ر جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ قیام گاہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر پیریمیٹ کی عالی شان اور خوب صورت مسجد ہے۔ اسی میں نماز جمعہ ادا کرنے کا خیال تھا۔ واحد صاحب نے مجھ سے کہا "مسلمانوں کی خواہش یہ ہے کہ آج آپ ہی خطبہ دیں اور امامت بھی کریں۔" میں چوں کہ حتی الوسع ان چیزوں سے اجتناب کرتا ہوں اس لئے میں نے معذرت کی لیکن انھوں نے کہا کہ آپ کی منظوری کی امید پر اس کا اعلان بھی کرایا جا چکا ہے تو میں نے خطبہ دینے کی حامی بھر لی اور امامت سے پھر بھی معذرت کی جس کو انھوں نے خوشی سے تسلیم کر لیا۔ مدراس کی مسجدوں میں عام طور پر خطبہ اردو میں ہوتا ہے اور سنا ہے بعض مسجدوں میں انگریزی میں بھی ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ عربی میں خطبہ کا ہونا اولیٰ ہے لیکن ناجائز اردو یا کسی دوسری زبان میں بھی نہیں ہے اور اگر خطبہ سے یہ فائدہ اٹھایا جائے کہ اس میں دین کی تعلیم دی جائے اور احکام و مسائل بیان کیے جائیں اور وہ ہی لگا بندھا خطبہ نہ ہو جیسا کہ آج کل کے امام قرآن کی کسی صورت کی طرح پڑھ دیتے ہیں۔ تو پھر میرے خیال میں اردو یا کسی اور مقامی زبان میں خطبہ دینا خلاف اولیٰ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس بہانہ سب مسلمان اس کو سن لیتے اور اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس مسجد کی ...... روایت کے مطابق آج کا خطبہ میں نے بھی اردو میں دیا جو ایک بجے شروع اور ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔ یہاں خطبہ کا اہتمام اس قدر ہوتا ہے کہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہی مسجد بھر چکی تھی۔ عبدالواحد صاحب اور دوسرے حضرات نے بتایا کہ جمعہ میں نمازیوں کی تعداد

عام طور پر دو ڈھائی ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ میرے خطبہ کا اعلان ہو چکا تھا اس لئے آج تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی اور لوگ دور دور سے آئے تھے۔ بہرحال میرے خطبہ کے بعد امامت جناب قاری عبدالباری صاحب نے کی جو حیدرآباد کے مشہور و مقبول قاری ہیں اور ان دنوں ایک ضرورت سے مدراس آئے ہوئے تھے۔

تقسیم کے بعد اب اگر کبھی دلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو یہ دیکھ کر سخت افسوس اور ملال ہوتا ہے کہ نمازیوں میں عظیم اکثریت بڈھے ٹھڈے لوگوں کی اور غریب غرباء کی ہوتی ہے جن کے چہرے اور لباس ان کی پریشان حالی اور افلاس کے مرثیہ خوان نظر آتے ہیں اور پھر شاہ جہاں کی اس عظیم یادگار کو دیکھئے تو فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا اور اکھڑا ہوا اور صفیں میلی کچیلی کٹی پھٹی اور اُدھڑی ہوئی در و دیوار پر بوسیدگی اور کہنگی کی دھند۔ خدا ایسا انقلاب کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے! ایک زمانہ تھا جب یہ جامع مسجد قوم و ملت کے لئے سرمایۂ نازش و افتخار تھی لیکن اسے دیکھ کر اپنی زبوں حالی اور احساسِ مذلت و نکبت کے ناآسودہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ اب اس وقت یہاں کی مسجد اور اس کے نمازیوں کو دیکھا تو جی باغ باغ ہو گیا۔ مسجد نہایت صاف ستھری، ٹپ ٹاپ اور نمازی اجلے اور صاف شفاف کپڑوں میں ملبوس۔ چہروں پر بشاشت آنکھوں میں عزم و ہمت کی چمک۔ قد و قامت کشیدہ، جسم پر خوش، حالی کی جھلک معلوم ہوتا تھا۔ یہ مسجد ایک زندہ قوم کی عبادت گاہ ہے۔ خیر! نماز سے پہلے اور نماز کے بعد بہت سے حضرات سے مصافحہ ہوا۔ عبدالواحد صاحب میرے پاس کھڑے ان کا تعارف کراتے جاتے تھے لیکن ظاہر ہے اتنے ہجوم میں اور روا روی کی اس ملاقات میں سب کے نام کہاں یاد رہ سکتے ہیں۔ ان میں بعض حضرات تو میرے پہلے سے شناسا اور متعارف تھے۔ جیسے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری حاجی سلیمان محمد سیٹھ صاحب اور بعض اور حضرات جن کا ذکر آئے گا۔ ان کے علاوہ جن صاحبوں سے ملاقات پہلی مرتبہ ہوئی ان میں صرف دو نام یاد رہ گئے ہیں۔ ایک حاجی نذیر احمد صاحب جو یہاں کے مشہور رمخیر اور اس مسجد کے منتظم یا متولی ہیں اور دوسرے جناب رؤف پاشا صاحب؛ ان کی شخصیت بڑی تاریخی ہے۔

۱۹۱۲ء میں یہ علی گڈھ میں پڑھتے تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے صحبت یافتہ اور خلافت تحریک میں ان کے رفیق کار رہ چکے ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی عہد میں اس سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس مولانا محمد علی مرحوم کی بعض تحریریں۔ مکاتیب اور ان سے متعلق کچھ ایسے معلومات ہیں جو کسی کے پاس نہیں ہوں گے۔ موصوف کی اس خصوصیت کے باعث میں نے ہر چند چاہا کہ ان سے پھر دوبارہ ذرا فرصت کی ملاقات ہو لیکن وہاں مسلسل ایسی مصروفیت رہی کہ اس ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی۔

لکچر | مطبوعہ پروگرام اور اعلانات کے مطابق ۱۶ر جولائی کی شام سے لکچروں کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک لکچر روزانہ کے حساب سے ۲۰ر تک یعنی پانچ دن مسلسل جاری رہا۔ مدراس کے مشہور نیو کالج کے اسمبلی ہال میں جس کا نام "انیکار عبدالشکور آڈیٹوریم" ہے۔ ساڑھے سات بجے شام سے ان کا آغاز ہوتا تھا۔ لکچر حسب ذیل پروگرام کے ماتحت ہوئے۔

۱۶ر جولائی: زیر صدارت جسٹس ایم۔ ایم۔ اسماعیل جج مدراس ہائیکورٹ۔

(۱) "عہد حاضر کے انسان کا روحانی ابتلا اور اسلام"

۱۷ر جولائی: زیر صدارت: پروفیسر عبدالوہاب بخاری۔

(۲) "قرآن میں انسان کا تصور اور اس کی عظمت"

۱۸ر جولائی: زیر صدارت ڈاکٹر محمد انوار الحق

(۳) "اسلام میں عورت کا مرتبہ اور حیثیت"

۱۹ر جولائی: زیر صدارت جناب ٹی۔ ایس۔ شعیب عالم،

(۴) "امن کا مسئلہ اور اسلام"

۲۰ر جولائی: زیر صدارت جناب بشیر احمد سعید سابق جج مدراس ہائی کورٹ

(۵) "اسلامی قانون عہد حاضر میں"

جس ہال میں لکچروں کا انتظام تھا اس میں سات سو نشستوں کا انتظام ہے۔ جن میں پچھلی دو سو

نشستیں عورتوں کے لئے مخصوص تھیں اور ایک باریک پردہ کے ذریعہ ان کو مردوں کی نشستوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ہال کم وبیش روزانہ بھرا ہی رہتا تھا۔ "کم وبیش" اس لئے کہ اگر ہال میں کچھ کرسیاں خالی نظر آتی تھیں تو لوگ برآمدوں میں یا لان پر بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ یہاں ان کو گرمی کے باعث ہال کے اندر گھٹن سے نجات مل جاتی تھی اور خود ان کے بقول لاؤڈ اسپیکر کی آواز بھی وہاں زیادہ صاف سنائی دیتی تھی۔ البتہ "عورتوں کا مرتبہ" اور "اسلامی قانون" پر جس روز لکچر تھا اس روز مردوں اور عورتوں کی تعداد غیر معمولی تھی اور پبلک میں کئی روز ان کا چرچا بھی رہا۔ حاضرین میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی مرد اور عورت بھی ہوتے تھے۔ لکچروں کی زبان انگریزی تھی۔ ہر لکچر گھنٹہ سوا گھنٹہ ہوتا تھا۔ البتہ مذکورہ بالا دو لکچر ذرا لمبے ہو گئے تھے وہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوئے۔ لکچر کے ختم پر واحد صاحب کی خواہش کے مطابق میں خود بھی اس موضوع پر اردو میں تقریر کرتا تھا جو کم وبیش نصف گھنٹہ کی ہوتی تھی۔ اس کے بعد جناب صدر تقریر کرتے تھے جو بیس پچیس منٹ کی ہوتی تھی۔ اس طرح روزانہ یہ صحبت شام دو ڈھائی گھنٹہ تک جاری رہتی تھی۔

زنانہ کالج میں تقریر لکچروں کے دنوں میں میں نے کوئی مصروفیت قبول نہیں کی اور کہیں آنا جانا بھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ صبح سے شام تک گفتگوؤں اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ لیکن قدیم تعلق کے باعث جناب بشیر احمد سعید صاحب کہاں معاف کرنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے قائم کئے ہوئے زنانہ کالج میں ۱۹ر جولائی کو ایک جلسہ اور اس میں میری تقریر کا پروگرام بنا لیا جس کے پاس خاطر سے مجھ کو منظور کرنا پڑا۔ میں جب مدراس پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں گیا تھا تو اس وقت بھی جناب موصوف کی دعوت پر کالج کی معلمات و متعلمات کو خطاب کیا تھا۔ اس مرتبہ جلسہ کا انتظام کالج کے نہایت وسیع اور عالی شان آسمبلی ہال میں تھا۔ جناب عبدالواحد صاحب کے ہمراہ میں وہاں پہنچا تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پورا ہال اوپر کی گیلریاں اور ادھر ادھر کے برآمدے سب طالبات سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے لیکن سب نہایت منظم اور باضابطہ! کیا مجال کہ ذرا بھی شور وشغب ہو۔ اسٹیج پر بشیر احمد سعید صاحب کے علاوہ کالج کی پرنسپل۔ گورننگ باڈی کے ممبران۔ اور چند مہمان بھی تھے۔

جن میں بعض پروفیسر اور بعض مدراس اسمبلی کے ممبر اور چند حضرات وہاں کے کاروباری طبقہ کے نمایندہ تھے۔ جلسہ ٹھیک ساڑھے دس بجے بیگم صاحبہ بشیر احمد سعید کی صدارت میں شروع ہوا جو کالج کی گورننگ باڈی کی صدر ہیں۔ پہلے ایک طالبہ نے خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کی۔ اس کے بعد ایک معلمہ نے کالج کے دستور کے مطابق قرآن مجید کی کچھ آیات پڑھ کر انگریزی میں ان کا ترجمہ سنایا۔ پھر جناب بشیر احمد سعید صاحب نے ایک مختصر تقریر میں جلسہ کی غرض وغایت بیان کرکے مقرر کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد میری تقریر "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عورتوں پر احسانات" پر انگریزی میں چالیس پینتالیس منٹ ہوئی۔ آخر میں محترمہ صدر صاحبہ نے خطاب کیا اور جلسہ ختم ہوگیا۔

زنانہ کالج کی ترقیات | بشیر احمد سعید صاحب زنانہ کالج کے اصل بانی اور معمار ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کالج ان کی غیر معمولی قوتِ عمل، جوش اور ولولۂ کار۔ اور بے لوث جذبۂ خدمتِ ملت اور قوم کا عظیم شاہکار ہے۔ جس طرح کسی ایک شاعر یا آرٹسٹ کی تمنا ہوتی ہے کہ کوئی صاحب ذوق آئے، اور تخلیق کو دیکھے اسی طرح موصوف کو یہ شوق ہے کہ کوئی آئے تو اسے اپنا کارنامہ جو تاریخ میں ان کی یادگار رہے گا اس کی ایک ایک چیز دکھائیں۔ چنانچہ ۵۶ء میں جب میں مدراس آیا تھا تو انھوں نے کالج کا مفصل معائنہ کرایا تھا۔ جس کی روئداد میں نے اسی زمانہ میں برہان میں لکھی تھی۔ اس کے بعد اب میں دوسری مرتبہ یہاں آیا تو ایک دن آج سے پہلے جس روز میں یہاں پہنچا تھا اسی کی شام کو کالج سیر کرائی تھی اور آج پھر جلسہ کے اختتام کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑے اور گذشتہ ڈھائی تین برس میں کالج کے اندر مختلف قسم کی جو ترقی اور اضافے ہوئے ہیں ان میں سے ایک ایک چیز کا تفصیلی معائنہ کرایا اور اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے رہے۔ سن رسیدگی اور ضعیف العمری کے باوجود سخت گرمی ہو یا سردی وہ گھنٹوں چلتے اور بولتے رہیں گے اور نہ ان کو تکان ہوگا اور نہ تعب۔ ان کو نہ ایک چائے کی پیالی درکار ہوگی اور نہ پانی کا ایک گلاس۔ وہ نہ پان کھاتے ہیں اور نہ سگریٹ کا شوق بس کام ہے اور ہر وقت کام۔ واقعی انسان میں کسی چیز کی لگن ہو تو ایسی ہو اور دھن ہو تو ایسی!

بے شبہ ان کی شخصیت ہمارے قومی کارکنوں کیا بلکہ نوجوانوں کے لئے ایک نمونۂ عمل اور مثالی شخصیت ہے

اب موصوف نے گھوم پھر کر کالج میں نئے اضافے جو میری پہلی مرتبہ کی آمد اور اس سفر کے درمیان ہوئے ہیں دکھائے تو میں حیران رہ گیا ۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) کم وبیش دس لاکھ روپیہ کے خرچ سے ایک بالکل جدید وضع کی عمارت لائبریری کے لئے بنکر تیار ہوگئی ہے ۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد شہنشاہ آریہ مہر ایران اور ان کی ملکہ نے رکھا تھا ۔اور اب حال ہی میں اس کا افتتاح صدر گری نے کیا ہے ۔

(۲) پانچ لاکھ کے صرف سے انتظامیہ (اڈمنسٹریشن) اور اس کے مختلف دفاتر کے لئے چار منزلوں کا ایک بلاک بنا ہے جو اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ ہے ۔اس بلاک کی تین منزلیں کرایہ پر اٹھادی گئی ہیں اس سے ترسٹھ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے ۔

(۳) انگریزی شعبہ کے لئے پانچ وسیع وعریض کمرے ۔شعبۂ تاریخ اور شعبۂ ریاضیات کے لئے الگ دو عمارتیں جو متعدد کمروں پر مشتمل ہیں ۔تقریباً پانچ چھ لاکھ کے صرف سے بن کر کھڑی ہو چکی اور اعلیٰ قسم کے فرنیچر اور ضروری سازوسامان سے آراستہ ہیں ۔

(۴) طالبات کے اعزا زواقربا جو ان سے ملاقات کرنے یا ان کے داخلہ وغیرہ کے سلسلہ میں یہاں آتے ہیں ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے ان کے واسطے ایک جداگانہ کمرہ (PARLOUR) جو کالج کے دروازے سے متصل ہے تعمیر ہوگیا ہے ۔

(۵) ہوسٹل پہلے ہی کچھ کم نہیں تھے کہ ان پر ایک اور نئی عمارت کا اضافہ ہوا ہے جس میں ڈیڑھ سو طالبات رہ سکتی ہیں ۔اس پر بھی ساڑھے تین لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے ۔یہ عمارتیں تو وہ ہیں جو گذشتہ ڈھائی تین برس میں تعمیر ہو کر مکمل ہو چکی ہیں ۔ان کے علاوہ پانچ ہزار نشستوں کا ایک پرشکوہ آڈیٹوریم زیر تعمیر ہے اور کالج کی حصار بندی بھی کر دی گئی ہے ۔میں جب پہلے آیا تھا طالبات کی تعداد تین ہزار تھی لیکن اب چار ہزار ہے اور معلمات کی تعداد ڈیڑھ سو ۔حقیقت یہ ہے اگر ترقی کی رفتار یہی رہی تو عجب نہیں آئندہ یہ کالج لڑکیوں کی ایک مستقل یونیورسٹی بن جائے جو ملک میں اپنی مثال آپ ہوگی ۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ایک تعلیمی ادارہ کی اصل روح تعلیم وتربیت ہے۔ اگر یہ اچھی اور صحت بخش نہ ہو تو عالی شان عمارتیں اور ظاہری طمطراق سب عروسِ زشت رو پہ لباس حریر سے کم بے وقعت اور بے فائدہ نہیں۔ کالج کے عمائد اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ اس بنا پر ظاہری اور مادی ترقی کے ساتھ معنوی اصلاح و ترقی سے بھی غافل نہیں رہے۔ چنانچہ دینیات کی تعلیم کا اہتمام شروع سے ہوتا آیا ہے اب اس پر اتنا اضافہ ضرور ہوا ہے کہ ہفتہ میں دو دن نماز ظہر کے بعد ریکارڈ پلیئر کے ذریعہ مسلمان طالبات کو قرآن مجید کی تلاوت سنائی جاتی ہے اور ہر لڑکی کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت مترجم قرآن مجید کا ایک نسخہ ساتھ لائے اور جن آیات کی تلاوت ہوتی ہے ان کا ترجمہ پڑھے۔ گذشتہ مرتبہ کی طرح اس بار بھی ایک دن مغرب کی نماز کالج کی مسجد میں ادا کرانے اور امامت کا اتفاق ہوا۔ سلام کے بعد دیکھا تو پیچھے دو صفیں لڑکیوں کی تھیں۔ دل سے بے ساختہ ان بچیوں کے لئے دعا نکلی اور ان کے لئے بھی جنھوں نے اس خوب صورت مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ یہاں مسجد میں قرآن مجید کے بہت سے نسخوں کے علاوہ ایک خاص وضع کا برقعہ بھی اس لئے رکھا ہوا ہے کہ بلاؤز کے استعمال کی وجہ سے جس لڑکی کے ستر کا کوئی حصہ کھلا ہوا ہے نماز کے وقت وہ اس کو پہن لے۔ علاوہ ازیں طالبات کی اخلاقی اور مذہبی اصلاح و نگرانی کے لئے کالج میں آئے دن مذہبی تقریبات بھی خاص اہتمام سے منائی جاتی ہیں۔

صفائی ستھرائی اور حفظانِ صحت کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہاں میں نے ایک ایسی چیز دیکھی جو یورپ اور امریکہ وغیرہ میں بھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ یہ کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں نہ ہو لیکن میرے نوٹس میں نہیں آئی اور وہ ہے "انسی نریٹر" (INCINERATOR) کارخانوں میں چمنی کی طرح لاٹ کی شکل کی ایک چیز ہے کالج میں جو کچھ کوڑا کرکٹ اور غلاظت ہوتی ہے۔ اس کو جمع کر کے اس کی جڑ میں جو گڑھا ہے اس میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ سب منٹوں میں جل جلا کے خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر آپ پورے

کالج میں گھوم جائیے نہ کہیں گندگی نظر آئے گی اور نہ غلاظت انہیں خصوصیات کی بنا پر میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہاں کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یونیورسٹی کے زنانہ کالج کو اس کالج سے سیکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد انوار الحق | کالج میں جلسہ کے بعد ٹی پارٹی کا بھی انتظام تھا۔ ڈاکٹر محمد انوار الحق جنھوں نے شب گذشتہ میرے تیسرے لکچر کی صدارت کی تھی وہ بھی مع اپنی بیوی اور بچی کے اس میں موجود اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت تو ان سے یوں ہی سرسری ملاقات ہوئی تھی اب ذرا اطمینان سے گفتگو کا موقع ملا۔ موصوف ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب مرحوم جنھیں بجا طور پر جنوبی ہند کا سرسید کہا جاتا ہے ان کے فرزند ارجمند ہیں۔ دس برس سے امریکہ میں مقیم اور وہاں کسی یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد ہیں اور وہاں کے شہری بن چکے ہیں۔ ان کے والد ماجد سے میرے مخلصانہ تعلقات تھے۔ مرحوم شروع سے "برہان" اور ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے خریدار اور ان کے بڑے قدرداں تھے اور مجھ ناچیز پر بہت بڑی نظر عنایت و کرم رکھتے تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر انوار الحق سے مل کر وہی خوشی ہوئی جو کسی دور افتادہ عزیز کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اور ان عزیز کو بھی اس کا احساس تھا کہ میرے اور ان کے والد مرحوم کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اسی سعادتمندانہ نیازمندی سے پیش آئے۔

ایک عجیب واقعہ | اثنائے گفتگو میں انھوں نے مجھ کو ایک واقعہ بھی یاد دلایا جس کو میں بھول چکا تھا لیکن ان کے حافظہ میں موجود تھا۔ واقعہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی! آپ بھی سن لیجئے:

"تا نہ خواہی و دشمن گر دو جہاں سے سینہ زار"

ہاں! تو ہوا یہ کہ جس زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ڈاکٹر عبدالحق پرو وائس چانسلر تھے میں کلکتہ میں تھا۔ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کلکتہ پہنچے۔ اور ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کے ہاں قیام کیا۔ مجھ کو کوئی علم نہیں تھا۔ ایک روز مغرب کے بعد کسی پارٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک پرچہ ملا جس میں لکھا تھا میں حاضر ہوا۔ مگر افسوس ملاقات نہ ہو سکی۔ اب میں کل صبح وانمباڑی جا رہا ہوں اور ڈاکٹر صدیقی کے ہاں مقیم

ہوں۔ میں فوراً ڈاکٹر صدیقی کے مکان پر پہنچا تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب دیکھتے ہی بغلگیر ہوگئے۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی بات چیت رہی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ان کارناموں کی داستان سنانی شروع کی جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں مسلمان طلبا کے حقوق کے تحفظ اور یہاں اسلامی روایات وشعائر کے احترام وبقا کے لئے پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے انجام دیئے تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے ان افراد واشخاص کا بھی ذکر کیا جن سے اس راہ میں ان کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ وہ داستان سرائی کرتے رہے۔ اور میں خاموش سنتا رہا۔ میں اگرچہ علی گڈھ سے بہت دور تھا لیکن تقسیم کے بعد یونیورسٹی سے متعلق حکومت کے جو ارادے اور منصوبے تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین جس طبیعت اور مزاج کے انسان تھے اور جس "کارِ خیر" کے لئے وہ یہاں بھیجے گئے تھے ان سب چیزوں کا مجھے اندازہ تھا۔ اس بنا پر مرحوم کے خاموش ہوتے ہی بے ساختہ میری زبان سے نکلا: "تو بس ڈاکٹر صاحب! اب آپ گئے"! مرحوم نے چونک کر پوچھا: "آخر یہ کیسے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟" میں نے عرض کیا: "مجذوب بڑ مارتا ہے دلیل نہیں دیتا"! میری زبان سے جو کچھ نکلا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم علی گڈھ واپس پہنچے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ علی گڈھ سے ان کا پتہ کٹ گیا اور اس سلسلہ میں وہاں جو جتن کیے گئے وہ کسی بھی تعلیمی ادارے کے لئے باعث صد ننگ ہیں۔ مرحوم نے مدراس پہنچ کر مجھے خط لکھا کہ میں تو آپ کی ولایت کا قائل ہوگیا۔ میں نے اس کا جواب لکھا۔ ڈاکٹر محمد انوار الحق کو یہ واقعہ اور خط وکتابت دونوں یاد تھے اور اس وقت انھوں نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا جس پر مجھ کو حیرت ہوئی۔ (باقی)